یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ

[اس ملک میں ایک مدت سے منکرین حدیث نے یہ پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا کہ یتیم پوتے کا اپنے دادا کی میراث سے محروم ہونا قرآن کے خلاف ہے۔ اس پروپیگنڈے کا اصل مدعا یتیم پوتے کو میراث دلوانا نہ تھا بلکہ فقہ اسلامی کے اُس پورے ذخیرے کو ساقط الاعتبار کر دینا تھا جو پچھلے ساڑھے تیرہ سو برس میں فراہم ہُوا ہے۔ اس لیے کہ وراثت سے یتیم پوتے کی محرومی ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابۂ کرام کے دَور سے لے کر آج تک تمام امت کے فقہاء متفق رہے ہیں اور اس میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری، اہلِ حدیث، شیعہ وغیرہ گروہوں کے علماء میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اب اگر ایک دفعہ یہ مان لیا جائے کہ یہ مسئلہ قرآن کے خلاف ہے، اور دوسری طرف یہ دیکھا جائے کہ اس میں فقہائے امت کے درمیان ایسا مکمل اتفاق ہے، تو پھر کوئی شخص بھی اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فقہ اسلامی کا یہ پورا ذخیرہ کسی اعتماد کے لائق نہیں ہے۔

اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر سب سے پہلے چودھری محمد اقبال صاحب چیمہ نے سابق پنجاب اسمبلی میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس کا منشا اسلامی قانون وراثت میں ترمیم کرنا تھا، اور جس کی تائید کے لیے لاہور ہائی کورٹ کے ججوں، اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں، ڈسٹرکٹ ججوں، سول ججوں، سرکاری محکموں کے اعلیٰ و ادنیٰ عہدہ داروں، وکیلوں اور میونسپل کمشنروں کی ایک فوج کھڑی ہو گئی جس نے پکارنا شروع کر دیا کہ ملا کے اس قانون کو بدل ڈالا جائے۔ اس کے بعد اب سابق چیف جسٹس آف پاکستان میاں عبدالرشید صاحب کی صدارت میں عائلی کمیشن نے جو رپورٹ پیش کی ہے اس نے پھر اس مسئلے کو تازہ کر دیا ہے۔ اس لیے ہم یہاں اس مسئلے کی پوری وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ذیل میں سب سے پہلے عائلی کمیشن کی رپورٹ کے اس حصے کا ترجمہ درج کیا جا رہا ہے جو یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق ہے۔ اس کے بعد چودھری محمد اقبال چیمہ صاحب کے مسودۂ قانون کی وہ

عبارت درج کی جائے گی جس میں انہوں نے اسلامی قانونِ وراثت پر اپنی مجوزہ ترمیم پیش کی تھی؛ اور آخر میں وہ تبصرہ نقل کیا جائیگا جو جمیلہ صاحب کے مسودۂ قانون پر جماعت اسلامی کی طرف سے ۱۹۵۴ء میں شائع کیا گیا تھا۔ چونکہ اس میں عائلی کمیشن کے تازہ دلائل کا پورا جواب آگیا ہے اس لیے اس پر کسی الگ بحث کی حاجت نہیں ہے، بلکہ سابق تبصرے کا اعادہ ہی کافی ہے۔ اگرچہ عائلی کمیشن کو پہلے ہی اس تبصرے کی طرف توجہ دلادی گئی تھی اور اس کی ایک کاپی بھی بھیج دی گئی تھی، لیکن جو لوگ ہٹ دھرمی اور ضد کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ دوسری طرف کے دلائل کی طرف توجہ نہیں کیا کرتے۔ اب یہ ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کا کام ہے کہ دونوں طرف کے دلائل کا موازنہ کرکے خود رائے قائم کریں۔]

عائلی کمیشن کی رپورٹ کا متعلقہ حصہ

"یہ بات کمیشن کے تمام ارکان نے تسلیم کی ہے کہ قرآنِ پاک یا کسی مستند حدیث میں ایسا کوئی حکم موجود نہیں جس کی رو سے ایک شخص کی زندگی میں مرجانے والے بیٹے یا بیٹی کی اولاد اپنے دادا کی میراث کا حصہ پانے سے محروم کی جاسکتی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں یہ رواج اہلِ عرب میں جاری تھا اور وہی رواج وفات یافتہ بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد کو دادا کی میراث سے محروم کرنے کے لیے بنیاد بنا لیا گیا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اگر ایک شخص کی موت کے وقت اس کا دادا زندہ ہو اور اس کا باپ پہلے مرچکا ہو تو اس کے ترکہ میں سے دادا وہی حصہ پاتا ہے جو متوفی کا باپ زندہ ہونے کی صورت میں پاتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اصول (ASCENDANTS) میں اسلامی قانون قائم مقامی (Representation) کا حق تسلیم کرتا ہے۔ لہٰذا یہ بات نہ منطق کی رو سے درست معلوم ہوتی ہے نہ انصاف کی رو سے کہ وہی قائم مقامی کا حق فروع (DESCENDANTS) میں تسلیم نہ کیا جائے۔ اگر ایک شخص کے پانچ لڑکے ہوں اور ان میں سے چار اس کی زندگی میں کچھ اولاد چھوڑ کر مرگئے ہوں تو کیا منطق یا انصاف کی رو سے کوئی معقول وجہ اس امر کی ہے کہ اس شخص کی تمام جائداد

اس کا صرف ایک لڑکا ہے اور دو مرے ہوئے لڑکوں کے بہت سے یتیم بچے میراث کے حق سے بالکل محروم ہو جائیں؟ اسلامی قانونِ وراثت غیر معقول اور غیر منصفانہ تو نہیں ہو سکتا۔ مزید براں جبکہ قائم مقامی کا حق ایک دادا کو اپنے اُس پوتے کی میراث سے حصہ پانے کا مستحق بناتا ہے جس کا باپ مر چکا ہو تو کیوں نہ یہی قاعدہ فروع میں بھی جاری ہو اور مرے ہوئے بیٹے یا بیٹی کی اولاد دادا کی میراث میں سے حصہ پائے؟ قرآن میں بکثرت احکام ایسے ہیں جن سے یتامیٰ اور ان کی جائداد کی حفاظت اور فلاح و بہبود کے لیے بڑی فکرمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ایسا قانون جو یتیم بچوں کو ان کے دادا کی میراث سے محروم کرتا ہو بالکل قرآن کی روح کے خلاف ہو گا۔"

"مولانا احتشام الحق صاحب کا بیان ہے کہ ائمہ اربعہ متوفی بیٹے یا بیٹی کی اولاد کو محجوب الارث قرار دینے پر متفق ہیں اور مولانا صاحب تمام ائمہ کی اس متفقہ رائے کے ہوتے اس مسئلے کو نئے سرے سے زیر بحث لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مولانا صاحب اس بارے میں اپنے خیالات اپنے اختلافی نوٹ میں واضح کریں گے۔"

"بعض جوابات میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ دادا وصیت کے ذریعہ سے اپنے پوتوں کے لیے ایک ثلث تک جائداد چھوڑ سکتا ہے۔ مگر یہ تجویز یتیموں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرتی جیسا کہ ہماری اوپر بیان کی ہوئی مثال سے ظاہر ہے۔ لہٰذا ہم سفارش کرتے ہیں کہ ایسا قانون بنایا جائے جس سے داداؤں کی میراث کے معاملہ میں یتیم پوتے پوتیوں کے ساتھ انصاف کیا جا سکے۔"

چودھری محمد اقبال چیمہ صاحب کا مسودۂ قانون

"چونکہ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ایک مورث سے پہلے فوت ہو جانے والے بیٹے یا بیٹی کے لڑکوں اور لڑکیوں، پوتوں اور پوتیوں، نواسوں اور نواسیوں، یا اس سے پہلے فوت ہو جانے والے بھائی کے لڑکوں اور لڑکیوں کا وراثت سے محروم ہو جانا اسلام کی روح کے مطابق نہیں ہے، اور انہیں اُس حقِ وراثت سے محروم نہ ہونا چاہیے جس کے وہ مستحق ہوتے اگر ان کا باپ، آخری مالک کے بعد زندہ

رہ جاتا، لہٰذا تجویز کیا جاتا ہے کہ مغربی پنجاب کے مسلم شخصی قانون (شریعت)، کا اطلاق کرنے والے ایکٹ نمبر ۹ ۱۹۴۸ء میں ترمیم کر دی جائے، اور حسب ذیل قانون بنایا جائے:

"ایسی صورت میں جبکہ ایک بیٹا یا بیٹی، بھائی یا بہن وفات پا جائے قبل اس کے کہ آخری مالک کی میراث تقسیم ہونے کا آغاز ہو، وراثت کا حق اس کے ان جانشینوں اور وارثوں کی طرف راجع ہو جائے گا جو تقسیم میراث کی ابتدا ہونے کے وقت زندہ موجود ہوں، گویا کہ مذکورہ بالا اشخاص آخری مالک کی وفات کے بعد منفصلاً مرے ہیں۔"

اس تجویز کے حق میں جو دلائل چودھری صاحب نے اپنے مسودۂ قانون کے خاتمہ پر درج کیے تھے وہ یہ ہیں:

"عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قائم مقامی کا اصول مسلمانوں کی وراثت کے شخصی قانون میں نہیں ہے اس بنا پر بحالت موجودہ آخری مالک کی وفات سے پہلے فوت ہو جانے والے بیٹے یا بیٹی اور بھائی یا بہن کے بچے اس کی میراث میں سے کوئی حصہ نہیں پاتے۔ مگر شریعت میں کوئی ایسی صریح ممانعت موجود نہیں ہے جو یہ قاعدہ مقرر کرتی ہو کہ یہ لوگ آخری مالک کے بچوں کے ساتھ حصہ پانے سے کلیتہً محروم رہیں۔ قانون کا یہ رائج الوقت تصور ان لڑکوں اور لڑکیوں اور بھائیوں اور بہنوں کی اولاد کو مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے جو آخری مالک کی زندگی میں فوت ہو گئے ہوں۔ اس لیے قانون کو اسلام کی روح کے مطابق بنانے کی خاطر مندرجہ بالا ترمیم تجویز کی گئی ہے۔"

چیمہ صاحب کے اس مسودۂ قانون اور عائلی کمیشن کی تجویز میں فرق صرف اس قدر ہے کہ عائلی کمیشن تو صرف یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کو حصہ دلوانا چاہتا ہے، مگر چیمہ صاحب ان کے علاوہ یتیم بھتیجوں بھتیجیوں اور بھانجوں بھانجیوں کو بھی وارث بنانا چاہتے تھے۔ اس فرق کے ساتھ دونوں کے دلائل اور مقاصد بالکل یکساں ہیں۔ اس کے بعد وہ تبصرہ ملاحظہ ہو جو جماعت اسلامی کی طرف سے چیمہ صاحب کے مسودۂ قانون پر شائع کیا گیا تھا۔

تقسیم میراث کے متعلق قرآن و سنّت کے اصولی احکام

(۱) قرآن اور سنّت کی رُو سے ایک آدمی اپنی زندگی میں اپنے پورے مال کا (خواہ وہ اس کا اپنا کمایا ہُوا ہو یا اسے میراث میں ملا ہو) مالک ہے اور اس امر کا اختیار رکھتا ہے کہ جس کو جتنا چاہے دے دے۔ وہ اگر اپنا پورا مال بھی کسی کو ہبہ کر دینا چاہے تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے خاندان میں اگر کوئی فرد مدد کا محتاج ہے اور وہ اس سے ہمدردی و محبت رکھتا ہے تو اسے پورا اختیار حاصل ہے کہ اپنے مال کا جس قدر حصّہ مناسب سمجھے اس کو عطا کر دے۔ اس آزادانہ حق پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو پابندیاں عائد فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ اولاد کو ہبہ دینے میں مساوات کا خیال رکھا جائے، کیونکہ اولاد میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے سے نہ صرف بھائی بہنوں کے درمیان رشک و رقابت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، بلکہ خود والدین اور اولاد کے تعلقات بھی بگڑ جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس ہبہ کا مقصد حق داروں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا ہو وہ جائز نہیں ہے۔

(۲) آدمی کو اپنی زندگی میں یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ اپنے خاندان کے جن افراد کو وہ مدد کا مستحق پاتا ہو ان کے حق میں اپنی موت سے پہلے وصیّت کر جائے۔ اس حقِ وصیّت پر قرآن مجید نے صرف یہ پابندی عائد کی ہے کہ اس میں "جَنَف" اور "اِثم" نہ ہو۔ یعنی ایسی وصیت نہ کی جائے جو ظلم و زیادتی اور حق داروں کی حق تلفی پر مبنی ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اس مجمل حکم کی تشریح کر کے اور پھر وصیت کے بارے میں تین پابندیاں عائد فرما دیں۔ اوّل یہ کہ وارثوں کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مقرر کر دیئے ہیں ان میں کمی یا بیشی کرنے کی وصیت نہیں کی جا سکتی (لا وصیۃ لوارث)۔ دوم یہ کہ جن لوگوں کے حصے قرآن میں مقرر نہیں کیے گئے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ ⅓ حصہ مال دینے کی وصیّت کی جا سکتی ہے۔ ⅔ لازماً وارثوں کے لیے چھوڑنا ہو گا۔ سوم یہ کہ کوئی شخص کسی وارث کو محروم الارث کرنے کی وصیت نہیں کر سکتا۔[1]

[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تینوں ہدایات کے متعلق یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ خود قرآن مجید کے ایک ارشاد

(۳) میراث کا سوال آدمی کی زندگی میں نہیں بلکہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ کچھ مال چھوڑ کر مر گیا ہو۔ قرآن میں اس بنیادی قاعدے کو متعدد مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:-

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ط (النساء۔ ۷)

مردوں کے لیے اُس مال میں سے حصّہ ہے جو والدین اور قریب تر رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے اس مال میں سے حصّہ ہے جو والدین اور قریب تر رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:-

اِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗ

اگر کوئی شخص ہلاک ہو جائے اور اس کے کوئی اولاد

۔ کی توضیح و تشریح ہیں، اور یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ اگر یہ تشریح آپ کی طرف سے نہ کر دی جاتی تو لوگ وصیت کرنے میں سخت بے انصافیاں کر جاتے لیکن منکرین حدیث کو یہ ضد ہے کہ وہ ہر اُس چیز میں کیڑے نکالنے لگتے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو، گویا کہ انہیں اب حضورؐ کے نام مبارک ہی سے چڑ ہو گئی ہے۔ چنانچہ ادارۂ طلوع اسلام کے شائع کردہ پمفلٹ "یتیم پوتے کی وراثت" میں ارشاد ہوتا ہے:

"مودودی صاحب نے ضمناً وصیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ $\frac{1}{3}$ حصہ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے۔ یہ چیز بھی قرآن کریم کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ قرآن نے وصیت کا پورا پورا حق دیا ہے اور کہیں یہ نہیں لکھا کہ وصیت صرف $\frac{1}{3}$ حصہ مال میں ہو سکتی ہے۔ اللہ نے وصیت کے حکم میں کہیں یہ نہیں کہا کہ وصیت صرف $\frac{1}{3}$ حصے میں ہو سکتی ہے لیکن ملّا کہتا ہے کہ نہیں تم وصیت صرف $\frac{1}{3}$ حصے میں کر سکتے ہو یعنی معاذ اللہ خدا کو اتنی بات بھی کہنی نہیں آتی تھی کہ وصیت $\frac{1}{3}$ حصے میں کی جا سکتی ہے۔ وہ اس کے لیے بھی روایات کا محتاج ہو گیا۔ یہ ہے ملّا کا روایاتی مذہب۔"

گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضد میں ان لوگوں کو اصرار ہے کہ ایک شخص قرآن کے مقرر کردہ حصوں میں رد و بدل کر دینے کی وصیت بھی کر سکتا ہے، اور کسی ایک وارث کو سب کچھ دے کر باقی سب وارثوں کو محروم بھی کر سکتا ہے۔

أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۔ نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو جو کچھ اس نے چھوڑا اس

(النساء۔ ۱۷۶) کا نصف بہن کے لیے ہے ۔

اسی طرح سورۂ نساء کی آیات ۱۱، ۱۲ میں میراث کا قانون بیان کرتے ہوئے بار بار تَرَكَ اور تَرَكْتُم اور تَرَكْنَ کے الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے ۔

(۴) مذکورۂ بالا بنیادی قاعدے سے جو اصول نکلتے ہیں وہ یہ ہیں :-

الف ۔ میراث کا کوئی حق مورث کی موت سے پہلے پیدا نہیں ہوتا ۔

ب ۔ میراث کے حقوق صرف ان لوگوں کو پہنچتے ہیں جو مورث کی موت کے بعد فی الواقع زندہ موجود ہوں، نہ کہ زندہ فرض کر لیے گئے ہوں ۔

ج ۔ مورث کی زندگی ہی میں جو لوگ وفات پا چکے ہوں ان کا کوئی حق اس کی میراث میں نہیں ہے، کیونکہ وہ اس وقت مر چکے تھے جب کہ سرے سے کوئی حقِ وراثت پیدا ہی نہیں ہوا تھا ۔ لہٰذا کوئی شخص ان پہلے کے فوت شدہ لوگوں کا وارث یا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے مورث کے ترکے میں اپنے کسی حق کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ البتہ اگر وہ بجائے خود اپنا کوئی شرعی حق اس کی میراث میں رکھتا ہو تو وہ اسے پا سکتا ہے ۔

(۵) مورث کے وفات پا جانے پر جو لوگ زندہ ہوں ان کے درمیان میراث تقسیم کرنے کے لیے قرآن جو قاعدہ مقرر کرتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ جو حاجت مند یا قابلِ رحم ہو اس کو دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ جو رشتے میں مورث سے قریب تر ہو، یا بالفاظِ دیگر مورث جس سے رشتے میں قریب تر ہو، وہ حصہ پائے اور قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر حصہ نہ پائے ۔

یہ قاعدہ سورۂ نساء کی آیت ۷ کے ان الفاظ میں بیان ہوا ہے :

م ۔ ہے اور کسی وارث کو محروم الارث قرار دینے کی وصیت بھی کر سکتا ہے ۔ صاف اور سیدھے الفاظ میں ان لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ نبی کو ہم زبان کھولنے کی اجازت نہ دیں گے ۔ قرآن کا جو مطلب نبی بیان کرے وہ غلط اور جو کچھ ہم بیان کریں وہی صحیح ہے ۔

مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۔ اس مال میں سے جو چھوڑا ہو والدین اور قریب تر رشتہ داروں نے ۔

(۶) ایک آدمی کے قریب ترین رشتہ دار کون ہیں، اس کو قرآن خود بیان کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا کتنا حصہ ہے۔ اُس کے بیان کی رُو سے وہ رشتہ دار یہ ہیں :-

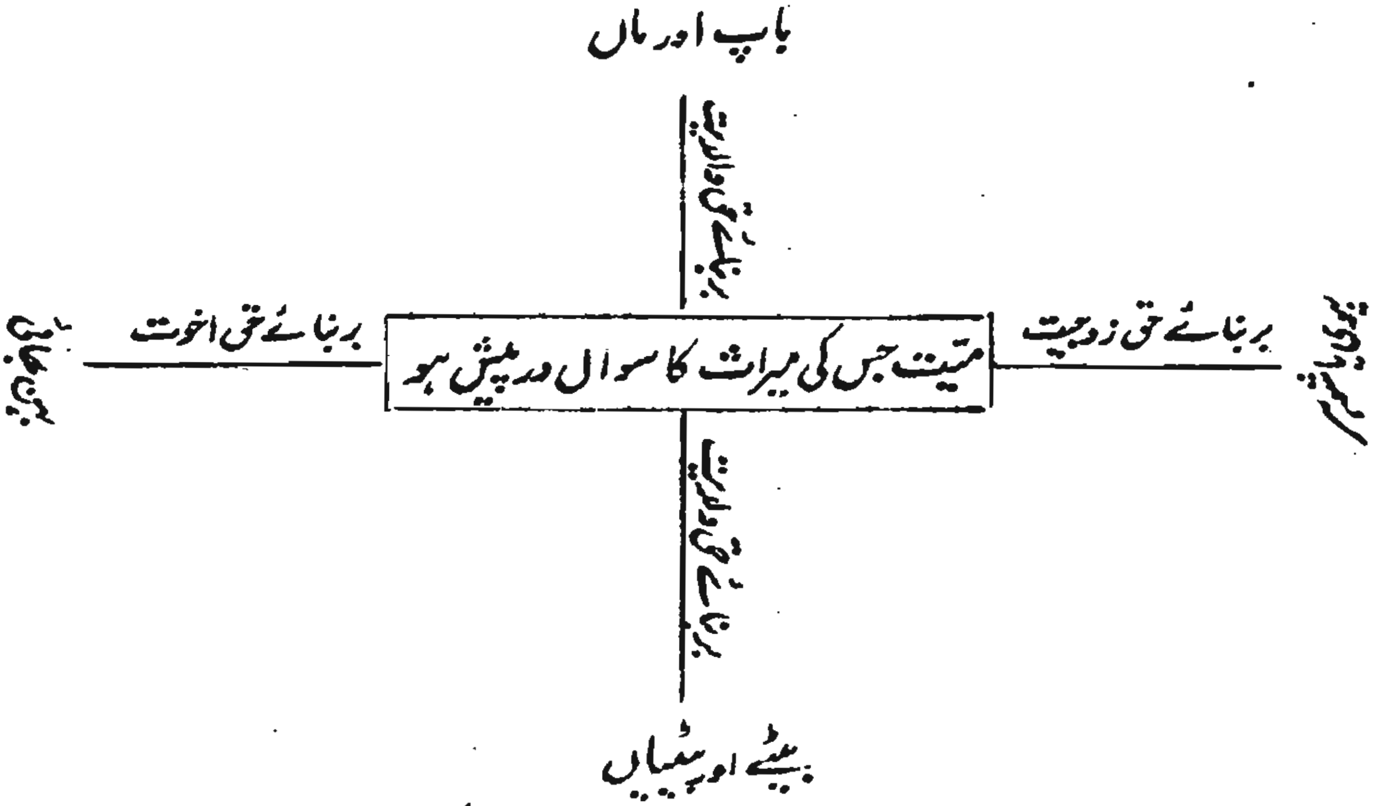

ان رشتہ داروں کو شریعت کی اصطلاح میں " ذوی الفروض " کہتے ہیں یعنی وہ رشتہ دار جن کے حصے خدا نے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ اس قرآنی انتظام پر ایک نگاہ ڈالتے ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں حقوق کی تقسیم چار سمتوں میں چار مختلف حیثیتوں سے کی گئی ہے :

الف - اوپر باپ اور ماں ہیں جن کو حقِ والدیت پہنچتا ہے ۔ یہ حق باپ اور ماں کی موجودگی میں کسی دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا ۔ البتہ اگر باپ نہ ہو تو حق پدری دادا کو اور دادا بھی نہ ہو تو پردادا کو پہنچے گا ۔ اسی طرح اگر ماں نہ ہو تو حق مادری دادی اور نانی کو، اور دادی اور نانی بھی نہ ہوں تو پردادی اور پرنانی کو پہنچ جائے گا ۔ اب چونکہ آدمی کا باپ ایک ہی ہوتا ہے اس لیے اس کے نہ ہونے

کی صورت میں حق پدری دادا کو پہنچ جاتا ہے، ورنہ اگر ایک آدمی کے دو یا زیادہ باپ ہوتے تو جب تک ان میں سے ایک بھی زندہ موجود رہتا دادا کو حق پدری نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ تین باپوں میں سے ایک کے مرتے ہی دادا اس کی جگہ آ کھڑا ہوتا اور پوتے سے کہتا کہ بیچ کی رکاوٹ ہٹ جانے کے بعد اب تو براہِ راست میرا نطفہ ہو گیا ہے۔

ب۔ نیچے کی طرف حق ولدیت ہے جو انہی بیٹوں اور بیٹیوں کو پہنچتا ہے جو میت کے نطفے یا اس کے بطن سے پیدا ہوئے ہوں۔ ان کی موجودگی میں یہ حق کسی طرح بھی اولاد کی اولاد کو نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ اگر ان میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تو حق ولدیت اولاد کی اولاد کو پہنچ سکتا ہے۔ باپ اور ماں کے برعکس ایک آدمی کے بچے چونکہ بہت سے ہو سکتے ہیں، اس لیے یہ بات اکثر پیش آتی ہے کہ ایک یا چند بچے آدمی کی زندگی میں مر جائیں اور ایک یا چند بچے اس کے مرنے کے بعد زندہ رہیں۔ اسی وجہ سے حق والدیت کے برعکس حق ولدیت کے معاملے میں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ اولاد کی موجودگی میں اولاد کی اولاد کو میراث نہیں پہنچتی۔ اس معاملے کی اصولی نوعیت کو جو لوگ نہیں سمجھتے وہ اس صورت حال کو دیکھ کر یہ اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ جب باپ کے مرنے پر حق والدیت دادا کو پہنچ جاتا ہے تو بیٹے کے مر جانے کی صورت میں حق ولدیت پوتے کو کیوں نہیں پہنچتا؟ حالانکہ یہ اعتراض اگر صحیح ہو سکتا تھا تو صرف اُس صورت میں جب کہ ایک آدمی بیک وقت تین چار آدمیوں کا بیٹا ہوتا اور پھر ان میں سے کسی ایک کے مر جانے پر دادا کو حصہ پہنچ جاتا، یا پھر ایک آدمی کی زندگی میں اُس کی ساری اولاد کے مر جانے کے باوجود اُس آدمی کے پوتوں پوتیوں کو حصہ نہ دیا جاتا۔ پھر یہ لوگ اس پر مزید ایک غلطی یہ کرتے ہیں کہ باپ کی غیر موجودگی میں دادا کے حق پدری پانے کو "قائم مقامی" (REPRESENTATION) کے قاعدے پر مبنی سمجھ لیتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ جس طرح باپ کے مرتے ہی دادا اس کی جگہ آ کھڑا ہوتا ہے اسی طرح بیٹے کے مرتے ہی پوتے کو اس کی جگہ آ کھڑا ہونے کی اجازت دی جائے۔ حالانکہ یہ معاملہ راشن ڈپو کے خریداروں کی قطار کا نہیں ہے بلکہ اصولِ قرب و بعد کا ہے۔ جب تک وہ شخص موجود ہے جس کا ایک آدمی براہِ راست نطفہ ہے اُس وقت تک حق پدری کسی ایسے شخص کو نہیں پہنچ سکتا جس کا وہ بالواسطہ نطفہ ہو۔ اسی طرح جب تک وہ اولاد موجود ہے

جو آدمی کی صلب سے براہِ راست پیدا ہوئی ہے اس وقت تک بالواسطہ اولاد کبھی "اولاد" کا حق لینے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ باپ کے نہ ہونے کی صورت میں دادا اس بنا پر حق پدری نہیں پاتا کہ وہ باپ کی جگہ آکھڑا ہوا ہے بلکہ اس بنا پر پاتا ہے کہ بلاواسطہ پدر کی غیر موجودگی میں بالواسطہ پدر کو آپ سے آپ یہ حق پہنچ جاتا ہے۔

ج۔ دائیں جانب حق زوجیت ہے جو صرف اس شخص کو پہنچ سکتا ہے جو فی الواقع میت کا زوج ہو۔ قائم مقامی کا اصول یہاں بھی نہیں پایا جاتا کہ شوہر کے حینِ حیات اگر بیوی مر چکی ہو تو اس کے وارثوں میں سے کوئی اس کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے شوہر کے ترکے میں سے حق زوجیت مانگنے لگے، یا شوہر بیوی کی زندگی میں مر چکا ہو تو اس کے وارثوں میں سے کوئی عورت کے مال میں سے حق زوجیت کا طلب گار ہو سکے۔

د۔ بائیں جانب حق اخوت ہے جو اولاد اور باپ کے نہ ہونے کی صورت میں صرف بھائی بہنوں ہی کو پہنچتا ہے، خواہ وہ حقیقی ہوں یا علاتی (یعنی باپ کی طرف سے) یا اخیافی (یعنی ماں کی طرف سے)، قائم مقامی کا اصول یہاں بھی نہیں ہے کہ بھائی کی غیر موجودگی میں اس کی اولاد قائم مقام ہونے کی حیثیت سے اس کا حصہ پائے۔ بھتیجوں کو اگر حصہ پہنچے گا تو ذوی الفروض کے نہ ہونے کی صورت میں، یا ذوی الفروض کے حصے ادا ہو جانے کے بعد عصبات ہونے کی حیثیت سے اپنے ذاتی حق کی بنا پر پہنچے گا نہ کہ کسی کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے۔

(۷) قرآن مجید نے صرف ان رشتہ داروں کے حقوق بیان کیے ہیں جو مذکورہ بالا چار حقوق میں سے کوئی حق رکھتے ہوں اور ان کے حصے اس نے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

اوّل: یہ کہ قرآن نے جو حصے مقرر کر دیئے ہیں ان کو ادا کر دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ کہاں جائے گا؟

دوم: یہ کہ قرآن نے جن رشتہ داروں کے حقوق مقرر کیے ہیں وہ اگر نہ ہوں تو کن کو وراثت پہنچے گی؟

ان دونوں سوالات کا جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مستند شارح قرآن ہونے کی حیثیت سے خود قرآن ہی کے اشارات کی بنا پر یہ دیا ہے کہ قریب ترین رشتہ داروں کے حق ادا ہو چکنے کے بعد، یا ان کی

غیر موجودگی ہیں، حقِ میراث اُن قریب ترجدی رشتہ داروں کو پہنچے گا جو ایک آدمی کے فطرتاً پشتیبان اور حامی و ناصر ہوتے ہیں۔ یہی معنی ہیں "عصبات" کے، یعنی آدمی کے وہ اہلِ خاندان جو اس کے لیے تعصب کرنے والے ہوں۔ اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو پھر یہ حق "ذوی الارحام" (رحمی رشتہ داروں مثلاً ماموں، نانا، بھانجے اور بیٹی یا پوتی کی اولاد) کو دیا جائے گا۔ یہاں بھی نہ تو قائم مقامی کا اصول کام کرتا ہے اور نہ یہ اصول کہ جو محتاج اور قابلِ رحم ہو اس کو میراث دی جائے۔ بلکہ قرآن کے بتائے ہوئے چار اصول اس معاملے میں کارفرما ہیں۔

ایک یہ کہ قریب ترین کے بعد حصّہ قریب تر کو پہنچے گا اور قریب تر کی موجودگی میں بعید تر حصہ نہ پائے گا (مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ)

دوسرے یہ کہ غیر ذوی الفروض کو وارث قرار دینے میں یہ دیکھا جائے گا کہ میت کے لیے نفع کے لحاظ سے قریب تر، یعنی اس کی حمایت و نصرت میں فطرتاً زیادہ سرگرم کون ہو سکتے ہیں۔ (أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا)۔

تیسرے یہ کہ عورتوں کی بہ نسبت مرد فطرتاً عصبہ ہونے کے زیادہ اہل ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن ماں اور باپ میں سے عصبہ باپ کو قرار دیتا ہے اور اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فرض حصے ادا کرنے کے بعد ما بقیٰ ترکہ قریب ترین مرد کو دو۔ لیکن بعض حالات میں عورت بھی عصبہ ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ میت کی وارث بیٹیاں ہی ہوں اور کوئی مرد عصبہ موجود نہ ہو تو بیٹیوں کا حصہ فرض ادا کرنے کے بعد ما بقیٰ میت کی بہن کو دیا جائے گا کیونکہ وہ اس کی پشتیبان ہوتی ہے۔

چوتھا اصول قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے کہ أُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ (رحمی رشتہ دار اجنبیوں کی بہ نسبت ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں) اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الخال وارث من لا وارث له (جس کا کوئی اور وارث نہ ہو اس کا وارث اُس کا ماموں ہے)۔

یہ ہیں تقسیمِ میراث کے اسلامی اصول جن کو سمجھنے میں کوئی ایسا شخص غلطی نہیں کر سکتا جس نے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو اور اس کے مضمرات پر غور کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عصبات کی تعیین اور ذوی الارحام

کی میراث کے مسائل کو چھوڑ کر قانونِ وراثت کے بنیادی اصولوں میں تمام امّت کے علماء شروع سے آج تک متفق رہے ہیں اور موجودہ زمانے کے بے علم مجتہدین کے سوا کبھی اسلامی تاریخ کے دوران میں یہ آواز نہیں سُنی گئی کہ قرآن کے اس قانون کو سمجھنے میں ساری امّت کے علماء بالاتفاق غلطی کر گئے ہیں۔

مجوّزہ ترمیمات

اب دیکھیے کہ تقسیمِ میراث کے ان اصولوں میں چچہ صاحب کیا ترمیمات تجویز کرتے ہیں:۔

اوّل یہ کہ اسلامی قانونِ میراث میں "قائم مقامی" کا اصول تسلیم کیا جائے اور جو بیٹے یا بیٹیاں اور بھائی یا بہن کسی شخص کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے ہوں، ان کے وارثوں کو ان کا قائم مقام مان کر یہ حق دیا جائے کہ وہ اس شخص کی میراث میں سے حصّہ پائیں۔

دوم یہ کہ اس نئے اصول کو اسلامی قانون میں کھپانے کی خاطر یہ بالکل خلافِ واقعہ بات فرض کر لی جائے کہ جو لوگ مورث کی زندگی میں مر گئے تھے وہ مرے نہیں بلکہ مورث کی وفات کے بعد تک زندہ رہے۔ اس جھوٹ پر قانون کی بنیاد رکھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ جب تک انہیں زندہ فرض نہ کیا جائے، قرآن کی رُو سے مورث کے ترکے میں ان کا اپنا ہی حقِ میراث پیدا نہیں ہوتا کجاکہ ان کے کسی قائم مقام کے حقِ وراثت کا سوال پیدا ہو سکے۔

سوم یہ کہ اس اصول کو عمل میں لانے کی خاطر مزید ایک جھوٹ یہ بھی فرض کیا جائے کہ وہ مرے ہوئے لوگ (جن کو زندہ فرض کیا گیا تھا) مورث کی وفات کے بعد بس اتنی دیر تک زندہ رہے کہ مورث کے مال میں ان کا حقِ وراثت قائم ہو گیا۔ اور یہ خدمت انجام دیتے ہی بے چارے سب کے سب بیک وقت وفات پا گئے۔ یہ دوسرا جھوٹ اس لیے قانون میں داخل کرنا ضروری ہے کہ اگر وہ فوراً ہی نہ مر جائیں تو وراثت اُن "قائم مقاموں" کی طرف منتقل کیسے ہو جنہیں چچہ صاحب حصّہ دلوانا چاہتے ہیں۔

چہارم یہ کہ اس نرالے اصول کی پیچیدگیوں سے بچنے کی خاطر ایک تیسرا جھوٹ یہ بھی فرض کر لیا

جائے کہ جو لوگ مورث کی زندگی میں یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں مرے تھے، انہوں نے مورث کی وفات کے بعد زندگی کے چند قانونی سانس لے کر بیک وقت وفات پائی، کیونکہ اگر ان کی قانونی وفاتوں کے درمیان وہی فاصلہ مان لیا جائے جو ان کی واقعی وفاتوں کے درمیان تھا، اور وہی ان کے مرنے کی ترتیب بھی مان لی جائے تو اندیشہ ہے کہ اس دوران میں ہر ایک کے بہت سے نئے "قائم مقام" پیدا ہو جائیں گے۔

یہ ہے وہ قانون جو اس دعوے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ پچھلے ۱۲۷۳ سال کے دوران میں جس قانونِ وراثت کو تمام امت کے علماء اسلامی قانونِ وراثت کہتے رہے ہیں وہ "اسلام کی روح" کے خلاف تھا، اور اب یہ قانون جس کی بنا پورے تین جھوٹوں پر رکھی گئی ہے، عین اسلام کی روح کے مطابق ہے۔

دلائل کا جائزہ

لطف یہ ہے کہ امت کے متفق علیہ قانونِ وراثت پر خطِ نسخ پھیرنے کے لیے توجیہ صاحب یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں کہیں صاف الفاظ میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ "بیٹوں اور بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے اور نواسے میراث نہیں پا سکتے" لیکن اپنے تجویز کردہ قانون کے حق میں انہوں نے قرآن کی کوئی آیت اور حدیث کی کوئی عبارت ایسی پیش نہیں فرمائی جس میں بالفاظِ صریح یہ لکھا ہو کہ "مورث کی زندگی میں مرجانے والے بیٹوں، بیٹیوں اور بھائی بہنوں کے وارث ان کے قائم مقام بن کر مورث کی وفات کے بعد اس کی وراثت میں سے حصہ لیں گے"۔ اس طرح کی صراحت اگر رائج الوقت شرعی قانون کے حق میں نہیں ہے تو توجیہ صاحب کے تجویز کردہ قانون کے حق میں بھی نہیں ہے۔ مگر منطق کے اصول توجیہ صاحب کے لیے خانہ زاد واقع ہوئے ہیں کہ ایک طرف تو نصِ صریح کی غیر موجودگی، اجماعِ امت پر مبنی ہوئے قانون کے خلاف دلیل بنتی ہے اور دوسری طرف وہی نصِ صریح کی غیر موجودگی، توجیہ صاحب کے اپنے تجویز کردہ قانون کے حق میں دلیل بن جاتی ہے۔

اس منفی استدلال کے ساتھ جو مثبت استدلال چیمہ صاحب نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ جو قانون وہ تجویز فرما رہے ہیں وہ روحِ اسلام کے مطابق ہے، اور جس قانون کو ساری امت کے علماء پچھلی تیرہ صدیوں سے قانونِ شرعی کہتے رہے ہیں وہ اس کے خلاف ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ کیا روحِ اسلام ہے جو اس قانون میں چیمہ صاحب کے پیشِ نظر ہے، اور وہ کہاں سے انہوں نے اخذ کی ہے؟ اگر وہ روحِ اسلام صرف یہ ہے کہ اسلام یتیموں اور بے کسوں کا حامی ہے اور اسی روح کو چیمہ صاحب قانون سازی کی بنیاد بنا دینے کے لیے کافی سمجھتے ہیں تو انہیں چاہیے تھا کہ قانونِ میراث میں ترمیم پیش کرنے سے پہلے قانونِ فوجداری میں یہ ترمیم پیش فرماتے کہ کسی ایسے قاتل کو موت کی سزا نہ دی جائے جو اپنے پیچھے نابالغ بچے رکھتا ہو۔ کیونکہ یتیم کو وراثت سے محروم کرنے کی بہ نسبت خود یتیم بنا دینا اور بھی زیادہ ظالمانہ فعل ہے جسے روحِ اسلام سے کوئی مناسبت نہ ہونی چاہیے۔ لیکن اگر وہ روحِ اسلام چیمہ صاحب نے قرآن کے قانونِ میراث سے اخذ کی ہے تو براہِ کرم وہ ہمیں بتائیں کہ قرآن کی کس آیت سے انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ تقسیمِ میراث کی بنیاد رشتے کے قرب و بُعد کے بجائے آدمی کا حاجت مند یا قابلِ رحم ہونا ہے؟ اور گلستانِ قرآنی کے وہ کون سے پھول ہیں جن سے یہ عطر انہوں نے کشید فرمایا ہے کہ قانون کی بنیاد حقائق کے بجائے جھوٹے مفروضات پر رکھی جائے؟

اعتراضات

اب ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ اس قانونی تجویز پر اصولاً کیا اعتراضات وارد ہوتے ہیں، اس سے کیا قباحتیں رونما ہوں گی اور یہ سراسر ایک معقول اور منظم قانونِ میراث کو کس طرح غیر معقول اور پراگندہ کر کے رکھ دے گا۔

اس پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ اسلامی قانونِ میراث میں "قائم مقامی" کا ایک بالکل غلط نظریہ داخل کر دیتی ہے جس کا کوئی ثبوت قرآن میں ہم کو نہیں ملتا۔ قرآن کی رُو سے جو شخص بھی میراث کا حصہ پاتا ہے خود میت کا اقرب ہونے کی حیثیت سے پاتا ہے، نہ کہ کسی دوسرے اقرب

کے قائم مقام کی حیثیت سے۔ اولاد کی غیر موجودگی میں اولاد کی اولاد، اور والدین کی غیر موجودگی میں والدین کے والدین اس لیے میراث نہیں پاتے کہ وہ کسی کے قائم مقام ہیں، بلکہ اس لیے پاتے ہیں کہ بلاواسطہ اولاد اور بلاواسطہ والدین کی غیر موجودگی میں بالواسطہ اولاد اور بالواسطہ والدین کو آپ سے آپ حق ولدیت اور حق والدیت پہنچ جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بیوی اور شوہر کے وارث چونکہ کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ حق زوجیت نہیں رکھتے اس لیے ایک مرد یا عورت کے مرنے پر اس کی بیوی یا اس کے شوہر کے وارثوں کو میراث میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ ورنہ اگر قائم مقامی کا اصول واقعی اسلامی قانون میں موجود ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ساس اور خسر اور سالے اور سوتیلے بچے میراث کا کوئی حصہ نہ پاتے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قائم مقامی کا اصول تسلیم کر لینے کے بعد یہ تجویز اس کو صرف بیٹے بیٹیوں اور بھائی بہنوں تک محدود رکھتی ہے، حالانکہ اس کے لیے کوئی معقول دلیل موجود نہیں ہے۔ اگر قائم مقامی کا اصول واقعی کوئی صحیح اصول ہے، تو پھر قانون یہ ہونا چاہیے کہ:

"ہر ایسا شخص جو مورث کی وفات کے بعد زندہ موجود ہونے کی صورت میں شرعاً اس کا وارث ہو وہ اگر مورث کی زندگی ہی میں مر گیا ہو تو اس کے تمام شرعی وارثوں کو اس شخص کا قائم مقام مانا جائے گا اور وہ مورث کی وفات کے بعد اس کی میراث میں سے حصہ پائیں گے۔"

مثلاً ایک شخص کی بیوی اس کی زندگی میں مر جاتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اس بیوی کے وارث اس کے قائم مقام نہ مانے جائیں؟ ایک شخص کا باپ اس کی زندگی میں مرتا ہے۔ قائم مقامی کا اصول تسلیم کر لینے کے بعد کونسی معقول دلیل ایسی ہے جس کی بنا پر اس متوفی باپ کے تمام وارثوں کو اس کا قائم مقام مان کر سب کو اس شخص کے ترکے میں حصہ دار نہ بنایا جائے۔ صرف اولاد اور بھائی بہنوں کے ورثا تک اس اصول کو محدود رکھنا اور زوجین اور والدین کے ورثا کو قائم مقامی کے حق سے مستثنیٰ کر دینا اگر کسی قرآنی دلیل پر مبنی ہے تو وہ ارشاد ہو، اور اگر کسی عقلی دلیل پر مبنی ہے تو اسے بھی چھپا کر

نہ رکھا جائے، ورنہ پھر سیدھی طرح یہ کہہ دیا جائے کہ جس طرح قائم مقامی کا اصول ہمارا خود ساختہ ہے اسی طرح اس کا انطباق بھی ہم جس طرح چاہیں گے اپنی مرضی سے کریں گے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ تجویز ان اصولوں کے بالکل خلاف ہے جو قانونی سمجھ بوجھ رکھنے والا کوئی آدمی قرآن مجید کے احکام میراث سے سمجھ سکتا ہے۔ قرآن کی رُو سے کوئی حق وراثت مورث کی زندگی میں پیدا نہیں ہوتا مگر یہ تجویز اس مفروضے پر قائم ہے کہ یہ حق مورث کی زندگی ہی میں قائم ہو جاتا ہے اور صرف اس کا نفاذ مورث کے مرنے تک ملتوی رہتا ہے۔ قرآن کی رُو سے میراث میں صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو مورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں۔ مگر یہ تجویز ان لوگوں کا حق بھی ثابت کرتی ہے جو اس کی زندگی میں مر چکے ہوں۔ قرآن کسی مردے کو محض میراث دلوانے کی خاطر زندہ فرض نہیں کرتا، مگر یہ تجویز مردوں کو زندہ فرض کر کے ان کے حصے وصول کرتی ہے اور پھر فوراً انہیں مردہ فرض کر لیتی ہے۔ قرآن بعض رشتہ داروں کے حصے قطعی طور پر مقرر کر دیتا ہے جن میں کمی بیشی کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، مگر یہ تجویز خود قرآن کے مقرر کیے ہوئے بعض حصوں میں کمی اور بعض میں بیشی کر دیتی ہے جیسا کہ ہم ابھی عملی تقسیم کی مثالوں سے بتائیں گے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ اگر اس قانون کو نافذ کر دیا جائے تو اسلامی قانونِ وراثت کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا، تقسیمِ میراث کی نہایت غیر معقول اور مضحکہ انگیز اور پیچیدہ صورتیں پیدا ہوں گی، اور اکثر حالات میں تقسیم قرآنی اصولوں ہی کے نہیں بلکہ صریح قرآنی احکام کے بھی خلاف واقع ہو گی۔ اس اعتراض کو واضح کرنے کے لیے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے اس تجویز کی عملی قباحتیں نمایاں ہو کر سامنے آجائیں گی۔

(۱) فرض کیجیے ایک شخص کی زندگی میں اُس کے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا انتقال ہو جاتا ہے جو دونوں شادی شدہ تھے، بہو بھی نکاح ثانی کر لیتی ہے اور داماد بھی دوسری شادی کر لیتا ہے۔ اس کے بعد یہ شخص دو زندہ بیٹے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے اس کے یہی دو بیٹے اس کی ساری جائداد کے مالک ہوں گے، مگر سیمیہ صاحب کے مسودۂ قانون کی رُو سے مردہ بیٹے کے حصے

کا چوتھائی اس کی بیوی کو اور مُردہ بیٹی کے حصے کا نصف اس کے شوہر کو دیا جائے گا۔ کیونکہ مردہ (مگر بحیثیت مفروضہ زندہ) زوجین کی وراثت کا حق زندہ بیوی اور شوہر کی طرف بحیثیت جانشین اور وارث کے راجع ہو جائے گا۔

(۲) فرض کیجیے کہ ایک شخص کے چار بچے اس کی زندگی میں مر جاتے ہیں۔ بعد میں یہ شخص چار بچے اور ایک بیوی (جو ان سب بچوں کی ماں ہے) چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے اس کی بیوی کو کُل جائداد کا ⅛ ملنا چاہیے اور باقی ⅞ چاروں زندہ بچوں کا حصہ ہے، مگر حبیبہ صاحب کے مسودہ قانون کی رُو سے ان بچوں کی ماں اپنے چاروں مرے ہوئے بچوں کے حصوں میں سے بھی ⅙ فی بچہ کے حساب سے وصول کرے گی۔ اس طرح ایک عورت کے جتنے زیادہ بچے شوہر کی زندگی میں مر چکے ہوں اتنا ہی زیادہ اس کا حق بڑھتا اور زندہ بچوں کا حق کم ہوتا چلا جائے گا۔

(۳) فرض کیجیے کہ ایک شخص کے دو ہی لڑکے تھے اور دونوں اس کی زندگی میں وفات پا گئے۔ ایک لڑکا اپنے پیچھے چار بچے چھوڑ کر مرا۔ دوسرا لڑکا صرف ایک بچہ چھوڑ کر مرا۔ قرآن کی رُو سے یہ پانچوں پوتے حق ولدیت میں بالکل برابر ہیں، اس لیے دادا کی جائداد میں سے ان سب کو برابر حصہ ملنا چاہیے، مگر حبیبہ صاحب کے مسودۂ قانون کی رُو سے اس شخص کی جائداد میں سے آٹھ آنے ایک پوتے کو ملیں گے اور باقی چار پوتوں کے حصے میں صرف دو دو آنے آئیں گے۔

(۴) فرض کیجیے ۱۹۵۴ء میں ایک شخص لاولد مرتا ہے۔ اس کے والدین پندرہ بیس برس پہلے مر چکے تھے، اب اس کا صرف ایک بھتیجا زندہ ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۴۰ء میں اس کا ایک بھائی مر گیا تھا اور اس کی جائداد اسی وقت اُس کے وارثوں میں تقسیم ہو گئی تھی مگر اب صرف اس کی بیوی زندہ ہے۔ ۱۹۴۵ء میں اس کی بہن مر گئی تھی اور اس کی جائداد بھی اُسی وقت اس کے وارثوں میں تقسیم ہو چکی تھی، مگر اب صرف اس کا شوہر زندہ ہے۔ لاولد مرنے والے شخص کا وہ بھائی بھی ۱۹۵۰ء میں مر گیا تھا جس کا ایک بیٹا اب تک زندہ ہے۔ اب ۱۹۵۴ء میں اس شخص کے مرنے پر رائج الوقت شرعی قانون کی رُو سے اس کی ساری جائداد اس کا بھتیجا لے گا لیکن حبیبہ صاحب کے مجوزہ قانون کی رُو سے اس کی وہ بھاوج بھی آتی ہے جس کا شوہر

۱۹۴۰ء میں مرا تھا، اور اس کا وہ بہنوئی بھی آ جاتا ہے جس کی بیوی ۱۹۴۵ء میں مری تھی اور یہ دونوں اپنے اپنے حصے وصول کر لیتے ہیں کیونکہ چیمہ صاحب کا یہ قانون ان دونوں، بھائی بہنوں کو زندہ فرض کرتا ہے جنہوں نے مورث کی وفات سے برسوں پہلے وفات پائی تھی اور پھر انہیں مورث کی وفات کے بعد فوراً ہلاک بھی کر دیتا ہے۔

(۵) فرض کیجیے کہ ایک شخص کی وفات کے وقت اس کی تین بیٹیاں اور ماں باپ زندہ ہیں۔ اس سے پہلے اس کی زندگی میں اس کی دو بیٹیاں مر چکی تھیں جن کی اولاد بھی موجود ہے اور شوہر بھی زندہ ہیں۔ قرآن کی رُو سے اس کی جائداد کا ۲/۳ حصہ زندہ بیٹیوں کو اور ۱/۳ والدین کو ملنا چاہیے، مگر چیمہ صاحب کا مسودۂ قانون دونوں مری ہوئی بیٹیوں کو زندہ فرض کر کے نہ صرف ان کی اولاد کو بلکہ ان کے شوہروں کو بھی حصہ دلواتا ہے اس موقع پر یہ دیکھ لیجیے کہ قرآن صاف الفاظ میں یہ کہہ رہا ہے کہ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ (اگر ہوں دو سے زیادہ لڑکیاں تو ان کے لیے اس مال کا ۲/۳ حصہ ہے جو مرنے والے نے چھوڑا) اور وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ (اور میت کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے اس کے ترکے میں سے ۱/۶ ہے اگر میت کی اولاد موجود ہو) لیکن یہاں قرآن کے مقرر کیے ہوئے دونوں حصے کم کیے جا رہے ہیں اور غیر موجود لوگوں کو موجود فرض کر کے ان کے وارثوں کو حصہ دلوایا جا رہا ہے۔

(۶) مختلف اوقات میں مرے ہوئے لوگوں کو زندہ فرض کرنے اور ان کے وارثوں کا حق یکے بعد دیگرے مرنے والے شخص کی میراث میں ثابت کرنے سے جو حسابی پیچیدگیاں واقع ہوتی ہیں ان کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس کو کبھی تقسیم میراث کے مسائل سے سابقہ پیش آیا ہو۔ چیمہ صاحب اور ان کے مسودے کی تائید کرنے والے اصحاب ذرا سا غور فرمائیں تو یہ بات ان کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ قانون میراث کی رُو سے ہر مرنے والے شخص کے ترکے میں چند آدمی وارث ہوتے ہیں۔ اب اگر ایک شخص کے اُن تمام اقربا کو زندہ فرض کر لیا جائے جو مثلاً اس کی پچاس سال کی زندگی میں مرے ہوں، اور ان میں سے ہر ایک کے وارثوں اور وارثوں کے وارثوں کا حصہ اس شخص کے ترکے میں ثابت کیا جائے تو میراث کا حساب لگانا اور اس کو عملاً تقسیم کرنا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔ اس کی توضیح میں بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، مگر ان کے پیش کرنے سے یہ مضمون عام فہم نہ رہے گا، اس لیے ہم مثالوں کو چھوڑ کر صرف ذی فہم اصحاب کے تصور سے

اپیل کرتے ہیں۔ وہ خود تصور کر کے دیکھیں کہ ایک شخص کی پنجاہ سالہ زندگی میں مرنے والے اقرباء کے ممکن وارثوں کا حساب کہاں جا کر ٹھیرے گا اور کون اس کا حساب لگا کر ترکہ تقسیم کر سکے گا۔ قرآن کے سمجھنے والے اہل علم نے میراث کا حساب اس وقت سے شروع کیا تھا جب کہ ایک شخص مر جائے اور پیچھے زندہ وارث چھوڑے۔ مگر وہ سب جاہل مُلّا قرار دیئے گئے۔ اب نئے مجتہدین ہر انسان کی موت سے پہلے اس کی میراث کھول کر حساب اُس وقت سے شروع کرتے ہیں جب وہ پیدا ہوا تھا اور زندگی بھر اس کے جتنے وارث ممکن ہو سکتے تھے ان سب کو اس کی موت کے وقت حصہ وصول کرنے کے لیے قبروں سے اٹھا کر لے آتے ہیں۔ اس کے عملی نتائج جب سامنے آئیں گے تو پتہ چلے گا کہ دراصل "جاہل مُلّا" کون ہیں۔

منکرینِ حدیث کی تازہ ترمیم

ان پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے جیبہ صاحب کے مسودۂ قانون میں تازہ ترمیم جو منکرین حدیث کی طرف سے پیش کی گئی ہے یہ ہے:

"مورث کا کوئی ایسا نسبی رشتہ دار جو اس کے ترکے میں سے اس کی وفات کے بعد حصہ پاتا، لیکن جو مورث کی وفات سے پہلے ہی فوت ہو گیا ہو، اس کی جگہ اس کا قریب ترین نسبی رشتہ دار لے لیگا اور مورث کی وفات کے وقت وہی حصہ پائے گا جو اس فوت شدہ کو ملتا۔ اگر وہ متعدد ہیں تو وہ حصہ ان میں قرآنی قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔"

چونکہ جیبہ صاحب اور ان کے ہم خیال اصحاب اس معاملے میں منکرین حدیث ہی سے الہام حاصل کر رہے ہیں، اس لیے بعید نہیں کہ وہ نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر اس سہارے کو تھام لیں جو عین وقت پر انہیں دیا گیا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اس کی طرف لپکیں ہم ان سے عرض کریں گے کہ ذرا اچھی طرح اس ترمیم اور اس کے نتائج کو سمجھ لیں۔

اس ترمیم میں دو مرحلوں پر "نسبی رشتہ دار" کی قید لگائی گئی ہے۔ پہلے مرحلے میں مورث کے وفات یافتہ ممکن وارثوں میں سے صرف نسبی رشتہ داروں کو قبروں سے اٹھا کر لایا جاتا ہے اور دوسرے

کو وہیں پڑا رہنے دیا جاتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں قبروں سے نکل کر حصہ وصول کرنے والے نسبی رشتہ دار جب از روئے قانون یکایک مر جاتے ہیں تو ان کے صرف نسبی رشتہ داروں کو میراث دلوائی جاتی ہے اور باقیوں کو دھتکار دیا جاتا ہے

سوال یہ ہے کہ یہ دو دو مرحلوں پر "نسبی رشتہ دار" کی قید "قرآنی قانونِ وراثت" کی کس دفعہ سے اخذ کی گئی ہے؟ اگر قرآن واقعی یہ اجازت دیتا ہے کہ ایک شخص کے جو ممکن وارث اس کی زندگی میں مر چکے ہوں انہیں اس کی وفات کے بعد میراث وصول کرنے کی خاطر قانونی زندگی عطا کی جائے تو پھر یہ انعام سارے ممکن وارثوں پر عام ہونا چاہیے۔ یہ بے انصافی قرآن میں کہاں پائی جاتی ہے کہ قبرستان سے صرف نسبی رشتہ داروں کو چھانٹ چھانٹ کر اٹھا لایا جائے اور بیوی یا شوہر کو جو عمر بھر مورث کے رفیق رہے، انہیں وہیں چھوڑ دیا جائے؟ پھر اس کو بھی جانے دیا جائے تو یہ کیا غضب ہے کہ جن نسبی رشتہ داروں کو آپ قبروں سے اٹھا کر لائے تھے ان کا حصہ مورث کی جائداد سے وصول کر لینے کے بعد آپ نے ان کے صرف نسبی رشتہ داروں کو وراثت عطا فرمائی اور دوسرے حق داروں کو محروم الارث کر دیا۔ کیا آپ قرآن سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ایک شخص اگر مورث کی وفات کے وقت قانونی مفروضے کے طور پر نہیں بلکہ واقعی زندہ ہوتا اور مورث کی وراثت میں سے حصہ پانے کے بعد مرتا تو اس کے صرف نسبی رشتہ دار ہی اس کی میراث پاتے؟

شاید آپ یہ کہیں کہ یہ قیود ہم نے قرآن کی نصِ صریح سے نہیں بلکہ "اسلام کی روح" سے اخذ کی ہیں۔ مگر ہم عرض کریں گے کہ یتیم بچوں پر رحم تو بلاشبہ "اسلام کی روح" ہے، مگر بیوہ عورتوں کے ساتھ ظلم کون سے "اسلام" میں ہے جس کی روح آپ نکال کر لائے ہیں؟ آپ کی ترمیم کا صاف منشا یہ ہے کہ جائداد بس اپنے نسب والوں میں رہے، متوفی کی بیوی یا شوہر کو دے کر دوسرے خاندانوں میں نہ پہنچائی جائے۔ یہ اسلام کی روح ہے یا پرانے ہندوانہ رواجی قانون کی روح؟

اچھا تھوڑی دیر کے لیے ان اصولی اعتراضات کو بھی جانے دیجیے۔ چیمہ صاحب کی تجویز کردہ ترمیم کے بجائے آپ کی یہ ترمیم ہی سہی۔ اس میں "نسبی رشتہ دار" سے ماں باپ تو خارج نہ ہونگے

فرض کیجیے ایک شخص کی زندگی میں اس کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ باپ کی ایک دوسری بیوی بھی تھی جس سے اولاد موجود ہے اور باپ کی اس بیوی سے بھی اولاد ہے جس کے بطن سے یہ شخص پیدا ہوا ہے۔ اس شخص کے اپنے بیٹے بیٹیاں بھی موجود ہیں۔ اب اس شخص کا انتقال ہوتا ہے۔ آپ اپنے قاعدے کے مطابق اس کے مرتے ہی میراث وصول کرنے کے لیے اس کے برسوں پہلے مرے ہوئے باپ کو قبرستان سے اٹھا لاتے ہیں اور "نسبی رشتہ دار" ہونے کی حیثیت سے وہ کل میراث کا ۱/۶ (خالص قرآنی حصہ) وصول کر لیتا ہے۔ اس حصے کو وصول کرنے کے بعد آپ کے قانونی مفروضے کے مطابق وہ فوراً ہی مر جاتا ہے۔ اب لامحالہ اس کے نسبی رشتہ دار اس کے وہ سب بیٹے بیٹیاں ہیں جو اس کی دونوں بیویوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ آپ کے "قرآنی قانونِ وراثت" کی رُو سے اس کے وہ پوتے اور پوتیاں اور نواسے اور نواسیاں بھی اس کے وارث ہیں جن کے ماں باپ اس کی زندگی میں مر چکے تھے۔ کیا آپ اس سے انکار کریں گے کہ یہ ۱/۶ ان سب میں تقسیم ہونا چاہیے؟ آپ کی تجویز کردہ ترمیم کی رُو سے یہ ضرور ہونا چاہیے، حالانکہ یہ صریح احکامِ قرآنی کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے جس شخص کی اولاد موجود ہو اس کے سگے اور سوتیلے بھائیوں کو میراث کا کوئی حصہ نہیں پہنچتا اور نہ اس کے مرے ہوئے بھائی بہنوں کی اولاد کوئی حصہ پانے کی حق دار ہے۔ مگر آپ اس کے مرے ہوئے باپ کو قبر سے اٹھا لائے اور اس کا حصہ وصول کر کے آپ نے زندہ اولاد کی حق تلفی کر دی، یہ صرف ایک مثال ہے۔ ایسی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ مرے ہوئے باپ، ماں، دادا، دادی، نانی وغیرہ کو جو سب "نسبی رشتہ دار" کی تعریف میں آتے ہیں، قانونی طور پر زندہ فرض کر لینے سے کیا پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد آپ شاید اس میں پھر ترمیم کریں گے اور "نسبی رشتہ دار" کی قید ہٹا کر "اولاد" کی قید بڑھائیں گے۔ کیونکہ "قرآنی قانونِ وراثت" آپ کی ذاتی ملکیت ہے۔ اس میں ہر طرح کے تصرفات کرنے کا آپ کو بے قید لائسنس ملا ہوا ہے۔ لیکن "اولاد" کی قید لگا کر بھی آپ پیچیدگیوں سے نہیں بچ سکتے۔ ایک شخص کی زندگی میں جو بچے مر چکے ہوں ان کو جب میراث وصول کرنے کے لیے آپ اس کی

وفات کے بعد قبروں سے اٹھا کر لے آئیں گے تو بے شمار مختلف طریقوں سے زندہ اولاد کی حق تلفیاں الگ ہوں گی اور حساب کی پیچیدگیاں الگ واقع ہوں گی۔

مسئلے کی اصل حقیقت اور اس کا صحیح حل

اوپر جو بحث ہم نے کی ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ امت کے تمام اگلے پچھلے علماء کو جاہل ملا قرار دے کر قرآن فہمی اور روحِ اسلام کی واقفیت کے بلند بانگ ادّعا کے ساتھ اجتہاد کا جو شاندار نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے اس کی علمی و عقلی حیثیت کیا ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے اجتہاد سے اگر اسلامی قوانین کی مرمت شروع کر دی گئی تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

اب ہم مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر ان لوگوں میں اپنے پورے ماضی کے خلاف یہ بغض نہ ہوتا، اور حدیث، فقہ اور تفسیر کے پورے ذخیرے کو غرقِ مئے ناب کر کے یہ حضرات قرآن کی من مانی تاویلیں کرنے پر نہ اتر آتے، تو اس مسئلے کا حل اسلامی قانونِ وراثت کے "رائج الوقت" نظام ہی کے اندر بآسانی نکل سکتا تھا۔

پہلے اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اصل مسئلہ فی الواقع کیا ہے اور کس طرح پیدا ہوا ہے۔

ہر خاندان کے کچھ اپنے مخصوص حالات ہوتے ہیں۔ کسی خاندان میں بیٹوں اور بیٹیوں کی یتیم اولاد ہوتی ہے۔ کسی میں نادار و محتاج بھائی بہن ہوتے ہیں۔ کسی میں کوئی بیوہ بھاوج ہوتی ہے۔ کسی میں کوئی بے سہارا بھتیجا ہوتا ہے۔ کسی میں چند غریب چچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد بھائی بہن ہوتے ہیں۔ اس طرح کے مختلف انفرادی حالات میں ایک صاحبِ خاندان خود ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کے گرد و پیش کون کس مدد کا محتاج ہے اور وہ اس کی کیا مدد کرے۔ کوئی جامع اور ہموار قانون ان بے شمار مختلف حالات کے لیے نہیں بنایا جا سکتا۔ قانون جب بھی بنایا جائے گا، الگ الگ انفرادی حالات کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ کسی خاص اصول پر بنایا جائے گا جو مجموعی طور پر

سب حالتوں میں یکساں چل سکتا ہو۔

قرآن مجید نے اس صورتِ حال کے لیے جو ضابطہ مقرر کیا تھا اس کے تین اجزا تھے :۔

(۱) صاحبِ خاندان اپنی زندگی میں مختار ہے کہ جس کو جو کچھ چاہے دے دے۔ اس قانونی اختیار کے ساتھ قرآن نے اپنے پیروؤں کو یہ اخلاقی ہدایت بھی دی کہ تمہارے رشتہ دار مدد کے اولین مستحق ہیں اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا تمہارا اخلاقی فرض ہے۔

(۲) مرنے سے پہلے ہر شخص کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اپنے پیچھے جن لوگوں کو چھوڑ رہا ہے ان کے حالات اور ضروریات کو ملحوظ رکھ کر جس کے لیے جو کچھ چاہے وصیت کر دے تاکہ وہ اس کی موت کے بعد پوری کر دی جائے۔ قرآن نے صرف یہ اختیار ہی نہیں دیا بلکہ یہ فرما کر اس کی تاکید بھی کر دی کہ اس طرح کی وصیت کر دینا متقی لوگوں پر ایک حق ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر اس کو اور زیادہ مؤکد کر دیا کہ آدمی پر ایک رات بھی ایسی نہ گزرنی چاہیے جس میں اس کی وصیت لکھی ہوئی نہ رکھی ہو۔ فرمانِ نبوی کے مطابق ایک شخص اپنی کل املاک کا ⅓ حصہ تک ان لوگوں کے لیے وصیت کر سکتا ہے جو قانونِ میراث کے مطابق اس کے ترکے میں سے حصہ نہ پا سکتے ہوں۔

(۳) مرنے کے بعد جو ترکہ آدمی چھوڑ گیا ہو وہ اس اصول پر تقسیم کیا جائے گا کہ جو لوگ رشتے میں مورث سے قریب تر ہوں وہ حصہ پائیں گے خواہ وہ محتاج نہ ہوں، اور جو بعید تر ہیں وہ حصہ نہ پائیں گے، خواہ وہ محتاج ہی ہوں۔ اس قاعدے میں مختلف خاندانوں کے انفرادی حالات کا لحاظ کر کے کوئی ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا، ورنہ پھر کوئی مستقل قانونِ میراث وضع کرنے کے بجائے ہر شخص کے قریب و دُور کے رشتہ داروں کی احتیاج کو مدِ نظر رکھ کر ہر بار ایک نیا قانونِ وراثت بنانا لازم ہو گا۔

اس انتظام پر غور کیجیے۔ اس میں مال کا ایک حصہ خود صاحبِ مال کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑا گیا ہے تاکہ وہ انفرادی حالات کے لحاظ سے جس طرح مناسب سمجھے اپنے اہلِ خاندان کی ضروریات

پوری کرے۔ اور ایک حصے پر قانونِ میراث جاری کیا گیا ہے جو بہرحال ایک جامع اصول ہی کے مطابق تقسیم ہو سکتا ہے۔ الگ الگ خاندانوں کے انفرادی حالات کے مطابق توڑا موڑا نہیں جا سکتا۔ اگر اس انتظام پر ٹھیک ٹھیک عمل ہوتا رہتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ مسائل پیدا ہو جاتے جن کو حل کرنے کے لیے چیمہ صاحب کے مسودۂ قانون کی ضرورت پیش آئی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب ہر معقول آدمی نفی ہی میں دے گا۔

پھر اب یہ مسائل کیسے پیدا ہو گئے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قرآن کے تجویز کردہ انتظام کی پہلی شق یعنی ہبہ پر حکومت کے موجودہ قوانین نے طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی ہیں، یہاں تک کہ ایک صاحبِ خاندان کے لیے اس پر عمل کرنا قریب قریب محال ہو گیا ہے۔ اور اس کی دوسری شق لوگ خود بھول گئے حتیٰ کہ اب شاذ و نادر ہی کوئی شخص اس طرح کی وصیت کرتا ہے جو قرآن و حدیث میں تجویز کی گئی ہے۔ اس کے بجائے لامحالہ ہر مورث کی پوری جائداد پر قانونِ وراثت جاری ہو جاتا ہے جس میں کسی خاندان کی انفرادی ضروریات کا لحاظ نہ تو کیا گیا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی اس مسئلے کے پیدا ہونے کا اصل سبب ہے کہ ایک مورث کی پوری میراث ان لوگوں کے حصے میں چلی جاتی ہے جو شرعاً وارث ہوتے ہیں، اور خاندان میں بہت سے وہ غیر وارث لوگ محروم رہ جاتے ہیں جن کی محرومی پر ہر ایک کو افسوس ہوتا ہے۔

جب یہ ہے اس مسئلے کی پیدائش کا اصل سبب تو بجائے اس کے کہ شرعی قانونِ میراث کو خواہ مخواہ ادھیڑ کر "قرآنی قانونِ وراثت" کے پُرفریب نام سے ایک سراسر غیر معقول قانون تصنیف کر ڈالا جائے، آخر کیوں نہ ان اصل اسباب کا تدارک کر دیا جائے جن کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے؟

دیکھیے، اگر حسبِ ذیل دو اصلاحیں کر دی جائیں تو تمام خرابیاں رفع ہو جاتی ہیں یا نہیں:

اوّل یہ کہ ہبہ پر سے وہ بے جا پابندیاں ہٹا دی جائیں جن کی وجہ سے ایک صاحبِ خاندان کے لیے اپنے اس با اختیار کا استعمال مشکل ہو جاتا ہے، اور سوچ سمجھ کر صرف ایسی پابندیاں لگائی جائیں جو اس کے بیجا استعمال کو روکتی ہوں۔

دوم یہ کہ وصیت کے لیے ایک قانون بنا دیا جائے جس کا ماحصل یہ ہو کہ جو شخص ہبہ اور وصیت کے بغیر مر گیا ہو اور اس کے خاندان میں ایسے غیر وارث اقربا موجود ہوں جو اس کی مدد پر منحصر تھے، اس کے

معاملے میں عدالتِ مجاز کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ اس کے ترکے میں سے ⅓ حصے کی حد تک جتنا مال مناسب سمجھے ایسے اقربا میں تقسیم کر دے

غالباً کسی ایسے شخص کو جو محض موجودہ صورتِ حال کی خرابی رفع کرنے کی خاطر چیمہ صاحب کے مسودے کی تائید کر رہا ہے، یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ یہ دونوں اصلاحات ساری خرابیوں کو رفع بھی کر دیتی ہیں اور قانونِ میراث کے نظام کو بھی درہم برہم نہیں کرتیں۔ البتہ وہ لوگ کسی تجویز سے بھی مطمئن نہیں ہو سکتے جن کا اصل مقصد یتیم پوتے کی مدد نہیں ہے بلکہ اس کی بے کسی کا ماتم کر کے رائے عام کو اس غرض کے لیے ہموار کرنا ہے کہ تمام ائمۂ اسلام سے، بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی قرآن کی تفسیر و تشریح کا حق چھین لیا جائے اور صرف ان لوگوں کے لیے یہ حق باقی رکھا جائے جو اسلام کی تمام روایات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے منشا کے مطابق قرآن کی آیات کو نئے نئے معنی پہنانا چاہتے ہیں، اس فتنے میں اگر کوئی پڑنا چاہے تو شوق سے پڑتا پھرے۔